

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب، از: ڈاکٹر اسرار احمد

درس ۵

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ○ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ○
مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ ○ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ
نَسْتَعِينُ ○ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○ صِرَاطَ
الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ
وَلَا الضَّالِّينَ ○ ﴾ (آمین)

اللہ تعالیٰ کے نام سے ہم آج کی صحبت میں اس سورہ مبارکہ کے مطالب و مفہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے، جو ہماری نمازوں کا جزو لازم ہے اور جس کو خود اللہ تعالیٰ نے ”القرآن العظیم“ سے موسوم فرمایا ہے۔ دین سے ادنیٰ شغف رکھنے والے ہر شخص کو بھی یہ سورہ مبارکہ لازماً یاد ہوتی ہے۔ تاہم مناسب ہو گا کہ ہم اس سورہ مبارکہ کے مطالب پر غور کرنے سے قبل اس کا سلیس اردو ترجمہ ذہن نشین کر لیں :

”کل شکر اور کل ثناء اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔

بہت رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔

(اے رب!) ہم تیری ہی ہدایت کرتے ہیں اور کریں گے، اور تجھی سے مدد چاہتے

ہیں اور چاہیں گے۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کی راہ کی جن پر

تیرا انعام ہوا، جن پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے۔“ (آمین ۱)

چند تمہیدی اور بنیادی باتیں

سب سے پہلے مجھے اس سورہ مبارکہ کے بارے میں چند تمہیدی باتیں عرض کرنی ہیں اور اس کے مضامین کا اجمالی تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ قارئین کرام ان کو گن گرا چھی طرح ذہن نشین فرمائیں اور انہیں ہمیشہ مستفہر رکھیں۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی مکمل سورہ

پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورہ ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں۔ مثلاً وہ پانچ آیات جو سورہ العلق کے ابتداء میں شامل ہیں۔ اور اس پر تقریباً اجماع ہے کہ وہ سب سے پہلی وحی ہے۔ اکثر محققین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورہ ”ن“ (جس کا دوسرا نام سورہ القلم بھی ہے) کے آغاز میں شامل ہیں۔ پھر تیسری وحی سورہ المزمل کی ابتدائی سات آیات ہیں اور چوتھی وحی سورہ المدثر کی ابتدائی سات ہی آیات ہیں، جبکہ پانچویں وحی جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہ سورہ فاتحہ ہے جو پہلی مکمل سورت ہے۔ پھر حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ سورہ مبارکہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے۔

سورہ الفاتحہ کی عظمت

دوسری بات اس سورہ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں ہے۔ اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے۔ چنانچہ چودھویں پارے میں سورہ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے :

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝﴾

”(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں (یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے) اور قرآن عظیم (عطا فرمایا)۔“

اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ”سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي“ سے مراد بھی سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور ”القرآن العظیم“ بھی اسی سورہ مبارکہ کو قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس سورہ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک مکمل قرآن ہے اور نہ صرف قرآن بلکہ ”قرآن عظیم“ ہے۔ سورہ الحجر کا وہ مقام جس میں یہ آیہ مبارکہ وارد ہوئی ہے وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی بیان فرما رہے ہیں کہ اے نبی ہم نے آپ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے جتنی بڑی نعمت کسی اور کو نہیں دی اور وہ ہے سورہ فاتحہ۔

اس سورہ مبارکہ کی عظمت ایک حدیث رسولؐ سے مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت ابی بن کعبؓ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”أَقْرَأَهُمُ أَبِي بَنْ كَعْبٍ“ یعنی ”صحابہ میں قرآن کے سب سے بڑے قاری (عالم) ابی بن کعب ہیں۔“ ان سے ایک بار خود نبی اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ ”اے ابی اکیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کروں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن مجید میں!“ جواب میں حضرت ابی بن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا: ”حضورؐ ضرور فرمائیے۔“ اس پر نبی اکرم ﷺ نے دوسرا سوال کیا: ”تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟“ حضرت ابیؓ نے جواب میں سورہ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ”یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی مثل و نظیر موجود ہے اور یہی ”سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي“ اور قرآن عظیم ہے!“

سورہ الفاتحہ کے عظیم نام

تیسری بات اس سورہ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام نام ”الفاتحہ“ ہے جو ”ف ت ح“ مادہ سے بنا ہے۔ ”فَتَحَ - يَفْتَحُ“ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ لہذا ”الفاتحہ“ کے معنی ہوئے ”قرآن مجید کی افتتاحی سورت“۔ یہ نام گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورہ

ہے۔ سب جانتے ہیں کہ عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں خصوصی محبت ہوتی ہے وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ مبارکہ کے بھی بے شمار نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اسے ”ام القرآن“ اور ”اساس القرآن“ بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورہ مبارکہ قرآن مجید کے لئے جڑ، بنیاد اور اساس کے مرتبے اور مقام کی حامل سورہ ہے۔ سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک اپنی حکمت اور اس کا ایک اپنا جداگانہ فلسفہ ہے۔ چنانچہ حکمت قرآنی کے لب لباب اس کے جوہر اس کے خلاصے اور قرآن حکیم کے طرز استدلال کے اعتبار سے بھی اس سورہ مبارکہ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اس سورہ مبارکہ کو ”الکافیہ“ کا نام بھی دیا گیا ہے یعنی یہ انسان کی فکری رہنمائی کے لئے کفایت کرنے والی سورت ہے۔ اس سورہ مبارکہ کو ”الشافیہ“ کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے یعنی اس میں شفاء ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید کو بھی ”شفاء“ قرار دیا ہے، چنانچہ سورہ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا :

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝﴾

”اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے، اور شفاء بھی دلوں کے امراض کے لئے اور رہنمائی اور رحمت ان کے لئے جو اس پر ایمان لے آئیں۔“

سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں فرمایا گیا :

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝﴾

”اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے۔“

یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے ذہنی و فکری شفاء اور دل کے روگ جیسے حسد، کینہ، بغض، تکبر وغیرہ باطنی امراض مراد ہیں۔ گویا انسان کی سوچ کو درست کرنے والی کتاب، کتاب الہی ہے اور باطن کے امراض کا دوا بھی

قرآن حکیم ہے۔ اس موقع پر ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں بہت گہرا ربط ہے۔ ذہن و فکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوں گے۔ قارئین کے علم میں ہو گا کہ آج کل کے دور میں امراض ذہنی و نفسیاتی کا بوجھ بڑھ چکا ہے۔ یہ دراصل فسادِ فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہذا اگر فکر صحیح ہوگی، سوچ درست ہوگی تو لازماً انسان کو جسمانی تندرستی بھی حاصل ہوگی۔ ان اعتبارات سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورہ مبارکہ بھی، کیونکہ یہ پورے قرآن کے خلاصے کی حامل سورت ہے۔ اس میں مومنوں کے لئے ہدایت کے ساتھ ذہنی، فکری اور قلبی شفاء بھی موجود ہے۔ مزید برآں یہ کلام اللہ ہے، اس پر کامل و اکمل یقین رکھنے والوں کے لئے اس میں جسمانی طور پر شفاء ہونا بھی مستبعد نہیں۔ سورہ فاتحہ کے جسمانی شفاء ہونے کا احادیث صحیحہ میں ذکر ملتا ہے۔

سورہ الفاتحہ کا اسلوب اور انداز

چوتھی بات اس سورہ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ کلام الہی ہے لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ گویا بندوں کو تلقین کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ مزید گہرائی میں اتر کر غور کریں تو درحقیقت انسان کی فطرت سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی ہے۔ گویا یہ سورہ مبارکہ ترانہ شکر و سپاس اور حمد و ثناء بھی ہے، اس میں اللہ کی ربوبیتِ کاملہ اور اس کے مالکِ ارض و سماء ہونے کا اقرار بھی ہے، اس کے رحمن اور رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اور اس کے جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار کل، نیز اس کے عادل و منصف اور قادرِ مطلق ہونے کا ايقان بھی ہے۔ پھر اس میں صرف اسی کی بندگی و پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول و قرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید برآں اس میں اسی سے صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی راہ پر چلانے کی دعا بھی ہے جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ، بلکہ ان کا شمار اللہ تبارک و تعالیٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندوں میں ہوا۔

گویا اس سورہ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لئے ایک دیباچہ بنا دیا گیا اور بقیہ

نماز کا جزو لازم

پانچویں بات بہت اہم ہے۔ یقیناً یہ بات تمام قارئین کرام کے علم میں ہوگی کہ یہ سورہ مبارکہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے، جو متفق علیہ ہے، یعنی جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ ”لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ“ یعنی ”اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔“ ایک اور حدیث قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور امام مسلم اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ حدیث طویل ہے جس پر ان شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ اصل نماز سورہ فاتحہ ہی ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لازم ہے۔

البتہ اس معاملے میں جو اختلاف ہے اسے چھٹی بات کے طور پر نوٹ کر لیجئے۔ یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر ائمہ دین اور فقہائے کرامؒ کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں،

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اسے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورہ تو ہر شکل میں پڑھنی ہے، جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سری رکعات میں بھی۔ دوسری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام سورہ فاتحہ پڑھے لیکن مقتدی قطعاً نہ پڑھیں، نہ جہری رکعات میں نہ سری رکعات میں۔ امام ہی کی قراءت مقتدیوں کی طرف سے سورہ فاتحہ کی قراءت شمار ہو جائے گی۔ جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے تو اس وفد کا قائد یا ترجمان جوابات کرتا ہے وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ ایک بین بین کی رائے بھی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورہ فاتحہ کی قراءت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سری رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قراءت کرے گا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے پڑھیں گے۔ ان آراء کے حاملین کے اپنے اپنے مسلک اور موقف کے لئے نہایت مضبوط اور مبسوط دلائل موجود ہیں۔

اس ضمن میں قارئین کرام کے سامنے جوابات اہمیت اور تاکید کے ساتھ لانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے ضمن میں ہمیں اپنے سینوں کو کشادہ رکھنا چاہئے۔ یہ اختلاف خلوص پر مبنی ہے۔ سب صحیح بات تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سب کے پاس اپنے موقف کے دلائل موجود ہیں۔ یہ فروعی اختلافات ہیں۔ دین کی اصل روح سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ہر رائے افضل و مفصل اور رائج و مرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہوتا ہے، جس کے متعلق اہلسنت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص اجتہاد میں خطا پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب عطا ہو گا اور اگر اجتہاد صحیح ہو تب تو اس پر دہرا اجر ملے گا۔ البتہ اس مسئلے کے ضمن میں خصوصی بات یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پر نماز پڑھ رہا ہو تو اسے لازماً ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ امام کی سورہ فاتحہ کی قراءت تمام مقتدیوں کی طرف سے بھی کفایت کرے گی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو بھی ہر رکعت میں امام کے پیچھے یہ سورہ پڑھنی ہوگی اور ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں خاموش رہے گا، البتہ بری رکعت میں خود بھی سورہ فاتحہ پڑھے گا۔

تعدادِ آیات

ساتویں بات اس سورہ مبارکہ کی آیات سے متعلق ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورہ کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورہ الحجرات کی آیت کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام مسالک کے نزدیک ”سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي“ کی مصداق یہ سورہ مبارکہ ہے۔ لہذا آیات کی تعداد سات ہونے میں کوئی اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام ”بسم اللہ“ کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں، جبکہ اکثر علماء ”بسم اللہ“ کو سورہ فاتحہ کا جزو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے جو سورہ براءۃ (سورہ توبہ) کے علاوہ ہر سورہ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے، لیکن اس سورہ کا جزو نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ علماء اور قراء کے مابین خلوص سے بھی اختلاف رائے ہوتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگرچہ وزنی رائے وہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کی ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں ”بسم اللہ“ شامل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس رائے کی پشت پر وہ حدیث قدسی ہے جس کا قدرے تفصیل سے ذکر آگے آئے گا۔

تین حصوں پر مشتمل سورہ

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے تین حصے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں لیکن نحوی اعتبار اور گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین ہی بنتے ہیں۔ پہلی تین آیات ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝“ گرامر کی رو سے ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ ”جملہ اسمیہ خبریہ“ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر و سبحة کا بیان ہے۔ پھر جو تھی

آیت جو اس سورہ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے خود ایک مکمل جملہ ہے، بلکہ اس کے مزید تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں۔ بہر حال یہ ہے ”جملہ فعلیہ خبریہ“۔ یہ مرکزی آیت ہے ”إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ وَإِنَّا كُنَّا نَسْتَعِيشُ“ ترجمہ ہے ”(اے رب ہمارے!) ہم صرف تیری ہی بندگی پر شش کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔“ یہاں حصر کا اسلوب ہے اور عربی میں چونکہ فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہوتے ہیں، لہذا ان امور کا ترجمہ میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس آیت میں رب اور بندے کے مابین ایک قول و قرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں، لہذا یہ ”جملہ فعلیہ خبریہ“ درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے۔ تیسرا حصہ جو آخری تین آیات پر مشتمل ہے: ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝“ یعنی ”(اے رب ہمارے!) ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کی راہ کہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔“ یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ ”جملہ انشائیہ“ ہے۔ یہ ایک دعا ہے۔ اس میں ایک بندہ اپنے رب سے جس کی وہ تحمید و تمجید کر چکا، جس کی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور عدالت کا اقرار کر چکا، پھر جس سے وہ عبادت و استقامت کا عہد بھی استوار کر چکا، اب وہ اسی رب سے اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی میرابی کے لئے ”صراطِ مستقیم“ یعنی زندگی بسر کرنے کے لئے معتدل و متوازن طرز زندگی اور راہ عمل کی رہنمائی اور توفیق کا طلب گار اور مستدعی ہے۔

اس موقع پر نویں اور آخری بات سے قبل وہ حدیثِ قدسی ترجمہ کے ساتھ پیش کرنی مناسب ہے جس کا ذکر پہلے دوبار ہو چکا ہے اور جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي

نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ (الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ
 الْعَالَمِينَ) قَالَ اللَّهُ تَعَالَى حَمْدُنِي عَبْدِي وَإِذَا قَالَ (الرَّحْمَنُ
 الرَّحِيمُ) قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَتْنِي عَلَى عَبْدِي وَإِذَا قَالَ (مَالِكُ
 يَوْمِ الدِّينِ) قَالَ مَجْدُنِي عَبْدِي وَقَالَ مَرَّةً فَوْضَ إِلَيَّ عَبْدِي
 فَإِذَا قَالَ (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) قَالَ هَذَا بَيْنِي وَبَيْنَ
 عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ فَإِذَا قَالَ (اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
 صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا

الضَّالِّينَ) قَالَ هَذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ (رواه مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

”میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا

ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لئے اور نصف حصہ میرے بندے کے لئے ہے اور

میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے ”الْحَمْدُ

لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی

(میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے ”الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی۔ جب بندہ کہتا ہے ”مَلِكُ يَوْمِ

الدِّينِ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی۔“

گویا یہ پہلا حصہ کل کا کل اللہ کے لئے ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل قارئین اس مقام پر یہ

بات نوٹ فرمائیں کہ اس حدیث قدسی میں ”قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ

عَبْدِي نِصْفَيْنِ“ کے بعد آیت ”بِسْمِ اللَّهِ“ کا ذکر موجود نہیں بلکہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ

رَبِّ الْعَالَمِينَ“ سے براہ راست بات آگے بڑھتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

آیت بسم اللہ سورہ فاتحہ میں شامل نہیں ہے۔ اب حدیث کی طرف رجوع فرمائیے :

”جب بندہ کہتا ہے ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے

بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اس نے طلب کیا۔“

گویا یہ حصہ ایک معاہدہ ہے، قول و قرار ہے، عہد و میثاق ہے۔ اس میں بندے نے ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کہہ کر اللہ کی عبادت کا عہد کیا ہے اور ”وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ میں کچھ طلب بھی کیا ہے، مدد بھی چاہی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے اپنے بندے کو دیا جو اس نے مجھ سے طلب کیا۔“ اب آخری حصہ رہ گیا۔ فرمایا :

”جب بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ..... وَلَا الضَّالِّينَ تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کاکل) میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اسے بخشا۔“

اس حدیث کی رو سے سورہ فاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیتہً اللہ کے لئے ہے اور آخری کلیتہً بندے کے لئے جبکہ درمیانی و مرکزی آیت ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ بندے اور اللہ کے مابین قول و قرار ہے۔ گویا اس کا بھی نصف اول اللہ کے لئے اور نصف ثانی بندے کے لئے۔ اس طرح نصف نصف کی تقسیم بہ تمام و کمال پوری ہو گئی!

”آمین“ کی حیثیت

اس سورہ مبارکہ کے بارے میں نویں اور آخری بات یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے اختتام پر ”آمین“ کہنا مسنون ہے۔ آمین کے معنی ہیں ”اے اللہ ایسا ہی ہو۔“ یہ ابتدا ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سورہ مبارکہ کا اسلوب دعائیہ ہے، لہذا دعا کے اختتام پر ”آمین“ کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہ الہی میں عرض کرتا ہے کہ ”اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے، تو اسے شرف قبول عطا فرما۔ اے پروردگار ایسا ہی ہو۔“

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد تمام فقہی مسالک میں آمین کہنے کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری رکعت میں آمین اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے تو ان سب آراء رکھنے والوں کے پاس

دلائل موجود ہیں۔ یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے۔ اس میں جو متفقہ بات ہے وہ ہماری رہنمائی کے لئے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک سورہ فاتحہ کی قراءت کے بعد ”آمین“ کہنا مسنون ہے۔

ہم نے اس سورہ مبارکہ کے بارے میں جو چند تمہیدی و بنیادی باتیں سمجھی ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری نمازوں میں جان، خشوع و خضوع اور حضوری قلب پیدا ہو جانے کا ذریعہ بنادے۔ اور جب ہم اپنی نمازوں میں سورہ فاتحہ کی قراءت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی اور قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورہ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں۔ اور دل کی گہرائیوں سے اس بات کے آرزو مند ہوں کہ اس سورت کے ذریعے جس صراطِ مستقیم کی استدعا کی جاتی ہے، وہ ہمیں بالفعل حاصل ہو جائے اور ہمیں اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہ ربانی سے ارزانی ہو۔ آمین!

سورۃ الفاتحہ کا جزو اول

سورہ فاتحہ کے سلیس و رواں ترجمے، اس کے بارے میں چند تمہیدی باتوں اور اس کے مضامین کے اجمالی تجزیے کے بعد اب ہم اس سورہ مبارکہ کے تینوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جیسے کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے اس سورہ مبارکہ کا جزو اول تین آیات پر مشتمل ہے :

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝﴾

”کل شکر اور کل ثناء اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔ بہت رحم فرمانے والا، نہایت مہربان، جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔“

الْحَمْدُ لِلَّهِ

نوٹ کیجئے کہ یہ سورہ مبارکہ قرآن مجید کی افتتاحی سورہ ہے اور اس کا ابتدائی کلمہ

ہے "الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ"۔ یہ کلمہ طیبہ نہایت عظیم اور بہت بلند مرتبت ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے لفظ "حمد" کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ صرف ایک لفظ "تعریف" سے کر دیا جاتا ہے، حالانکہ تعریف بھی عربی کا لفظ ہے اور حمد بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے، ان کے معنی و مفہوم میں لازماً کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو لفظ "حمد" میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک شکر اور دوسرا ثناء۔ شکر کا لفظ سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں تفصیلاً زیر بحث آچکا ہے۔ وہاں واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہو تو اس کا تقاضا جذبہ تشکر ہے اور اگر عقل صحیح نوج پر کام کر رہی ہو تو اس کا حاصل اپنے منعم حقیقی اور اپنے اصل مربی و محسن یعنی اللہ کو پہچان لینا ہے۔ فطرت سلیہ اور عقل صحیحہ دونوں کے امتزاج سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کا نام "حکمت" ہے۔ لہذا حکمت کا لازمی تقاضا اللہ کا شکر ہے۔ یہی بات اس سورہ مبارکہ کے ابتدائی کلمات میں آئی ہے کہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" لیکن حمد کا لفظ شکر سے زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ کسی کا شکر ایسی چیز پر ادا کیا جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ شکر کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو۔ لیکن ثناء اور تعریف کی جاتی ہے کسی بھی حسن و جمال یا کمال کی خواہ اس کا ہمیں کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ حمد کے لفظ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں، یعنی شکر بھی اور ثناء بھی۔ لہذا ہم نے ترجمہ میں ان دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ "کُلُّ شکر اور کُلُّ ثناء اللہ کے لئے ہے۔"

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے تو آپ اس نتیجے سے اتفاق کریں گے کہ یہ کلمہ توحید ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی مظہر حسن ہے، مظہر کمال ہے، مظہر جمال ہے ان کے متعلق ہماری عقل صحیحہ یہ رہنمائی کرتی ہے کہ ان تمام محاسن و کمالات کا منبع اور سرچشمہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ لہذا اصل تعریف اور ثناء ان اشیاء کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ہوتی ہے۔ کلمہ توحید کا اقتضاء یہی ہے کہ موجد کے شعور اور تحت الشعور سب میں یہ بات مستحضر رہے کہ کائنات کی ہر نعمت، ہر چیز، ہر حسن، ہر جمال اور ہر کمال الغرض کوئی وصف کسی کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔

جیسے تصویر میں اگر کوئی حسن ہے تو وہ درحقیقت مصور کے کمالِ فن کی عکاسی ہے۔ تصویر کا اپنا کوئی حسن نہیں، نہ اس کا کوئی اپنا ذاتی کمال ہے۔ بالکل اسی طرح کسی مخلوق میں اگر کوئی حسن اور کمال ہے یا کوئی خوبی اور جمال ہے تو وہ حسن و کمال اور خوبی و جمال خالق کا ہے، نہ کہ مخلوق کا۔ چنانچہ اس کُل سلسلہ کو کون و مکان میں جہاں کوئی حسن، کوئی کمال، کوئی خیر، کوئی خوبی اور کوئی جمال ہے یا کسی شے میں کوئی نفع رسانی کا پہلو ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ لہذا شکر کا سزاوارِ حقیقی اور تعریف و ثناء کا اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ کلمہ ”الْحَمْدُ لِلّٰہ“ اتنا عظیم اور اعلیٰ مرتبت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمہ آسمان و زمین کو اپنی برکات سے بھر دیتا ہے۔ فرمانِ نبویؐ ہے: ”الْحَمْدُ لِلّٰہ تَمَلُّا الْمِيزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہ تَمَلِّانِ [اَوْ تَمَلُّا] مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“۔ (مسلم) ”کلمہ سبحان اللہ میزان کو نصف بھر دیتا ہے اور جب ایک انسان ساتھ ہی الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ نہ صرف میزان کو پُر کر دیتا ہے بلکہ آسمان و زمین کے مابین جو خلا ہے، جو فضا ہے اس سب کو پُر کر دیتا ہے“

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور احسانات کے ضمن میں انبیاء و رسل علیہم السلام اور صالحین کے جو کلماتِ شکر منقول ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ نے جن دعاؤں کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر میں یہ کلمہ ”الحمد للہ“ استعمال ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کی خاطر دو مثالیں قرآن مجید اور دو مثالیں حدیث شریف سے پیش کرنے پر اکتفا کرنی ہوگی۔ سورۃ ابراہیم میں وارد ہے کہ جب بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ جیسے صالح فرزند عطا فرمائے جو آگے چل کر منصبِ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے تو اس احسان و انعام و نعمت اور کرم پر حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر ترانہ شکر جاری ہوا کہ ”الْحَمْدُ لِلّٰہ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلٰی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعٌ الدُّعَآءِ“ (آیت ۳۹) یعنی ”کُل شکر اور ثناء اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسمعیلؑ اور اسحاقؑ عطا فرمائے۔ یقیناً میرا رب دعا کا سننے (اور قبول کرنے) والا ہے۔“ ایک اور مثال سورۃ اعراف سے دیکھ لیجئے۔ جب مومنین صارقین کو حساب کتاب

کے بعد جنت میں داخلے کا اذن ملے گا تو ان کی زبانوں پر کلمہ شکر و سپاس اور تعریف و ثناء الفاظ میں جاری ہو گا کہ ”وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنَّ هَدَانَا اللَّهُ“ (آیت ۴۳) ”اور وہ کہیں گے کل شکر اور کل ثناء اس اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی (بلکہ یہاں تک پہنچا دیا) اور ہم خود ہدایت نہ پاسکتے (اور یہاں تک ہرگز نہ پہنچ پاتے) اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا۔“ رسول اللہ ﷺ نے سو کراٹھنے کی یہ دعائیں فرمائی کہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ“ یعنی ”کل شکر و ثناء اللہ کی ہے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ ہم پر موت طاری کر دی تھی اور (ایک دن اسی طرح) اس کی جانب لوٹ جانا ہے“ اور اکل و شرب کے بعد کی دعا ان الفاظ میں تلقین فرمائی ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ یعنی ”کل شکر اور ثناء اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمانوں میں شامل فرمایا۔“

رَبِّ الْعَالَمِينَ

اب آگے باری تعالیٰ کی چند مزید صفات کمال کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی بات سامنے آتی ہے۔ ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“ جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ ”رب“ کے لفظ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ عرب گھر کے مالک کو رَبِّ الْبَيْتِ یَا رَبِّ الدَّارِ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں رب کا لفظ مالک کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورہ قمریش میں آتا ہے : ”فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ“ یعنی ”پس عبادت کرو اس گھر (حرم شریف) کے مالک کی۔“ پھر رب کا مفہوم پرورش کرنا، ترقی اور نشوونما دینا بھی ہے۔ ایک مالک ایسا نا اہل اور ناکارہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی ملکیت کو لے کر بیٹھ رہے۔ اس کی ترقی اور نشوونما کی اسے کوئی خاص پروا نہ ہو اور ایک مالک ایسا قابل و قادر ہوتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیزیں ہیں وہ ان میں سے ہر چیز کو اس کی استعدادات کے مطابق پروان چڑھائے اور ہر شے کو اس کے نقطہ کمال تک پہنچانے کا سامان فراہم کرے اپس اللہ کی ذات گرامی وہ ہے جو ہر شے کے نقطہ عروج و کمال تک پہنچنے کے حیلہ مقصیات کو فراہم

کرنے اور بہم پہنچانے والی ہے۔ ”عَالَمِین“ عالم کی جمع ہے۔ لہذا یہاں رب العالمین کا مفہوم ہو گا سارے جہانوں کی مخلوقات کا مالک اور پروردگار اللہ ہی ہے۔ آقا بھی وہی ہے اور پرورش کنندہ بھی وہی ہے۔

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ

اگلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک اور وصف ”الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ“ کے الفاظ میں بیان ہوا۔ یہ اللہ سبحانہ کے دو بڑے عظیم صفاتی نام ہیں۔ دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ اسی رحمت سے ”رحمن“ اور اسی سے ”رحیم“ بنا۔ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عربی زبان میں ”فَعْلَانُ“ کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس میں ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جیسے کسی شے میں جوش و خروش اور طوفانی اور ہيجانی کیفیت ہو۔ خود ہیجان بھی فَعْلَان کے وزن ہی پر ہے۔ تشبیہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، اس میں زبردست ہلچل ہو۔ کسی صفت کی یہ کیفیت ہو تو عربی میں اسے اکثر فَعْلَان کے وزن پر لایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کہا جائے ”أَنَا عَطْشَانُ“ تو مفہوم ہو گا ”میں شدید پیاسا ہوں یا پیاس سے مر جا رہا ہوں“۔ ”أَنَا جَوْعَانُ“ میں بہت بھوکا ہوں یا بھوک سے میری جان نکل رہی ہے“۔ ”هُوَ غَضَبَانُ“ وہ نہایت غصے اور طیش میں ہے“۔ ان امور کو سامنے رکھتے اور اب رَحْمَن کے لفظ کو سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے! رَحْمَن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے۔ جس کی رحمت میں انتہائی جوش و خروش ہے۔

البتہ ”فعلیل“ کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس صفت میں اس کے دوام و استمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ وقتی جوش و خروش نہیں ہے بلکہ اس میں پائیداری و استواری اور مستقل مزاجی ہے۔ گویا اللہ کی رحمت کی شان یہ بھی ہے کہ اس میں دوام اور استمرار ہے جیسے ایک دریا ہمواری کے ساتھ مسلسل بہہ رہا ہے، اس میں ہیجان نہیں ہے۔ سمندر کی طرح کا جوش و خروش نہیں ہے۔ لیکن بہاؤ کا ایک خاموش اور پُر سکون تسلسل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں شانیں ہیں جو اس سورہ مبارکہ میں بیک وقت

موجود ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت رحمن بھی ہے، رحیم بھی ہے۔ اس بات کو ایک تشبیہ سے مزید سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ سڑک پر کوئی حادثہ ہو گیا ہو جس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے ہیں اور فرض کیجئے کہ اس حادثے میں ایک ایسی عورت بھی ہلاک ہو گئی جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ زندہ ہے اور اپنی مردہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر کون انسان ہو گا جس کے دل میں رقت پیدا نہ ہو اور شفقت و رحمت کے جذبات موجزن نہ ہو جائیں۔ ہر انسان یہ چاہے گا کہ یہ بچہ جو بے سہارا ہو گیا ہے، میں اس کی کفالت اپنے ذمہ لے لوں، اس کی پرورش میں کروں۔ لیکن اگر وہ اس جوش میں یہ ذمہ داری لے بیٹھا، تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر یہ وقتی جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں ہی کے بعد اسے محسوس ہو کہ میں یہ کیا غلطی کر بیٹھا! میرے اپنے بچے ہیں، میری بے شمار ذمہ داریاں پہلے سے موجود تھیں، اب ان پر مستزاد یہ بوجھ میں نے خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا۔ گویا وقتی طور پر وہ بیچانی کیفیت جو اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کے زیر اثر اس نے بے سہارا بچے کی کفالت کی ذمہ داری لے لی تھی، اس میں دوام و استمرار نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت ہیں۔ وہ بیک وقت رحمن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ“ کے مابین حرفِ عطف ”و“ نہیں آیا بلکہ یہاں فرمایا ”الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ“ یعنی اس میں یہ دونوں صفات، یہ دونوں شانیں بیک وقت بہ تمام و کمال موجود ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ یہ سورہ فاتحہ یعنی قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورہ کی پہلی دو آیات ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف ہمارے سامنے آتا ہے اس میں کون سی چیز غالب ہے؟ وہ ہے اس کی ذات کا لائقِ حمد و ثناء اور قابلِ شکر و امتنان ہونا اور اس کی ربوبیتِ عامہ اور اس کی رحمتِ تامہ! یہ ہے اللہ سبحانہ کا ابتدائی تعارف جو قرآن نوعِ انسانی سے کراتا ہے۔ یہاں اس اعتراض کو بھی پیش نظر رکھ لیجئے جو بعض مستشرقین اور ان کی تقلید میں اکثر آریہ سماجیوں نے قرآن مجید اور اسلام پر کیا ہے، پھر اس اعتراض کے صحیح

جواب کو بھی جان لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ کے خوف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خوف، تقویٰ، میدانِ حشر کے مصائب، جہنم کے عذاب اور اس کی روح فرسا تفصیلات کی بہت تکرار ہے، جبکہ ہمارے مذہب میں اللہ کی محبت اور اس کے شفیق و رحیم ہونے پر بہت زور ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید پر بہتان ہے، اس لئے کہ قرآن مجید بالکل افتتاحی سورۃ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا جوابدہی تعارف کر رہا ہے وہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کسی خوفناک ہستی کا تعارف نہیں ہے بلکہ ایک پروردگار اور پالنے والا، ایک سرپا رکھتہ و شفقت ذات، ایک شفیق اور دودوستی اور ایک رحمن و رحیم آقا کا تعارف کر رہا ہے جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے اور جس کی ذاتِ اقدس میں تمام محاسن موجود ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا اصل اور حقیقی تعارف تو یہ ہے جو سورۃ فاتحہ کی ان دو آیات میں بیان ہوا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس نہیں ہوتے، اکثر لوگ پست ذہنی سطح ہی کے حامل ہوتے ہیں، جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مرد نادان پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایسے لوگوں کے لئے ضرورت ہے کہ انہیں خوف بھی دلایا جائے، ان کے دلوں میں باز پرس کا احساس بھی اجاگر کیا جائے، ان کو عذابِ الہی سے خبردار بھی کیا جائے اور برے کاموں کی سخت سزا سے ڈرایا بھی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دونوں چیزیں یعنی اللہ تعالیٰ کے غفور، ستار، رحیم، رحمن، رؤف، ودود ہونے کی شانیں بھی ملیں گی اور تبار، ذواِ انتقام، سریع الحساب ہونے کا ذکر بھی ملے گا۔

ابتداء میں نبی اکرم ﷺ کو جو احکام ملے ہیں ان میں آپؐ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے: **يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِرُ ۖ قُمْ فَأَنْذِرْ** ”اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہو جاؤ (کمر بستہ ہو جاؤ) اور لوگوں کو خبردار کرو“۔ ایک اور جگہ فرمایا: **وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ** ”اور (اے نبی) اپنے رشتہ داروں اور قریبی اعزاء کو خبردار کیجئے“۔ تو ابتداء میں انداز کا ملو ضرور غالب رہا لیکن اصولاً قرآن مجید

جس اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ معاذ اللہ کوئی خوفناک ہستی نہیں بلکہ محبت کرنے والی اور محبت ہی نہیں پرستش کرنے کے لائق ہستی ہے، اس سے محبت کرو، اسے چاہو، اس سے لو لگاؤ، جیسے کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا: ”وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ“ (آیت ۱۶۵) ”جو واقعتاً صاحب ایمان ہیں وہ تو سب سے زیادہ شدید محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں۔“ اور اس محبت کی اساسات ہیں جو سورہ فاتحہ کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے آئیں کہ اللہ تعالیٰ تمام محاسن و کمالات کا جامع ہے، منع و سرچشمہ ہے، وہ کائنات کا رب ہے، مالک ہے، پروردگار ہے، پالنے والا ہے، وہ الرحمن الرحیم ہے۔ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور استمرار اور دوام کے ساتھ بننے والے دریا کے مانند بھی ہے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ

تیسری آیت میں دوسرا رخ آ رہا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا، یعنی انذار۔ فرمایا: ”مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ زندگی محض اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے، جس میں آزمائش ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے، جیسے سورہ ملک میں فرمایا: ”خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْسَمُكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا“ (آیت ۲) ”موت اور زندگی کو اللہ نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ تم کو آزمائے اور دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔“ لہذا اس آزمائش اور امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن بھی ہو۔ اور وہ دن آکر رہے گا جس دن لوگوں کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا، ہر انسان کا محاسبہ ہو گا اور اسے جواب دی کرنی ہوگی۔ اس محاسبہ اور حساب کتاب کے نتیجے میں جزا یا سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یہ ہو گا ”یوم الدین“ جس کے متعلق ہم آئیر کے درس میں پڑھ چکے ہیں، اس کے بارے میں سورہ الذاریات میں فرمایا گیا: ”اِنَّمَا تُوعَدُوْنَ لَصَادِقٍ ۝ وَاِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝“ (آیات ۶۵) ”جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی۔“ اس محاسبہ کے نتیجے میں یا جنت ہوگی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہوگی دائمی، جیسا کہ نبی اکرم

ﷺ کے ابتدائی خطبات میں سے ایک خطبہ کے آخر میں آتا ہے :

وَاللّٰهُ لَتَمُوْنَنَّ كَمَا تَسْمُوْنَ، ثُمَّ لَتَبْعُنَّ كَمَا تَسْتَبِقُظُوْنَ،
ثُمَّ لَتَحْسَبَنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُحْزَرُوْنَ بِالْإِحْسَانِ احْسَانًا
وَبِالسُّوْءِ سُوءًا، وَآتِهَا الْحَتَّةَ أَبَدًا أَوْ لَنَارًا أَبَدًا

”اللہ کی قسم تم سب (ایک دن) مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً
اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب
کتاب ہوگا، پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور ریرائی کا برا (اور یہ اس شکل
میں ہوگا کہ وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی)۔“

اس فیصلے اور جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار صرف اللہ ہے۔ ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“
اور اس روز اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن
مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ اس روز ایک ندا ہوگی : ”لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ“ یعنی
”آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟“ اور پھر جواب میں فرمایا جائے گا : ”لِلّٰهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ“ (المؤمن : ۱۶) ”آج تمام اختیار اور کل بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے جو
الواحد ہے، تنہا ہے، یکتا ہے اور پوری طرح سے قابو یافتہ اور مسلط ہے، مقتدر اعلیٰ ہے، جو
چاہے کرے۔“

یہ ہے اس سورہ مبارکہ کا پہلا حصہ جس کے بارے میں میں حدیث قدسی کے حوالے
سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کلمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ادھر بندہ کہتا ہے ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعَالَمِينَ“ اور اگر یہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں تو فوراً اللہ تبارک و تعالیٰ
جواب میں ارشاد فرماتا ہے : ”میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا“ اور جب بندہ کہتا ہے
”الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“ تو اللہ جواب میں فرماتا ہے : ”میرے بندے نے میری ثناء
کی۔“ جب بندہ کہتا ہے ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ تو اللہ فرماتا ہے : ”میرے بندے نے
میری بڑائی کا اعلان کیا اور میری عظمت بیان کی۔“

لفظ ”اللہ“ کی تحقیق

اس پوری بحث میں ایک دقیق لغوی و علمی مسئلے کو جان بوجھ کر نہیں چھیڑا گیا۔ اور وہ

ہے لفظ ”اللہ“ کی تحقیق۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عام فہم انداز میں بیان کی دی جائیں۔

لغوی اعتبار سے لفظ ”اللہ“ کے بارے میں دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اسم جلد اور اسم علم ہے، یعنی نہ اس کا کوئی مادہ ہے، نہ یہ کسی اور لفظ سے بنا ہے، بلکہ یہ اسم ذات ہے اس ہستی کا جس نے اس سلسلہ کون و مکان کو تخلیق فرمایا۔ لہذا اصل ضرورت اس اسم ہی کو حرزِ جاں بنانے اور دل پر کندہ کرنے کی ہے نہ کہ اس کے معنی کے کھوج کرید کی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے بقیہ تمام اسماءِ حسنیٰ کے مانند صفاتی نام ہے اور لفظ ”الہ“ پر لام تعریف داخل کر کے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں الہ حقیقی اور معبودِ برحق!

پھر خود ”الہ“ کے مادے کی تحقیق بھی ایک دقیق اور طوالت طلب معاملہ ہے، لیکن تین مفہوموں پر تقریباً اجماع ہے۔ ایک وہ ہستی جس کی طرف حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے رجوع کیا جائے، دوسرے وہ ہستی جس کے بارے میں عقل حیران اور سرگشتہ ہو کر رہ جائے اور تیسرے وہ ہستی جس سے والہانہ محبت ہو۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ عوام الناس کی رسائی اکثر و بیشتر صرف پہلے مفہوم تک ہوتی ہے، جبکہ فلاسفہ کا تحیر و لا ادریت دوسرے مفہوم کے مظہر ہیں اور صوفیاء تیسرے اور بلند ترین مفہوم سے سرشار ہوتے ہیں..... واللہ اعلم!!

جزو ثانی : عبادت اور استعانت

اس سورۃ مبارکہ کا جزو ثانی ایک آیت پر مشتمل ہے اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے یہ ہر اعتبار سے اس سورۃ کی مرکزی آیت ہے، یعنی

﴿إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ وَإِنَّا كُنَّا نَسْتَعِيزُ﴾

یہاں پہلی بات یہ نوٹ فرمائیے کہ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں، ایک

”نَعْبُدُ“ اور دوسرا ”نَسْتَعِينُ“ یہ دونوں فعل مضارع ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ اردو کی طرح عربی و فارسی میں فعل کی تین حالتیں ماضی، حال، اور مستقبل نہیں ہوتیں، بلکہ صرف دو حالتیں ہوتی ہیں، ایک ماضی اور دوسری مضارع، اور فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں، لہذا ”نَعْبُدُ“ کا ترجمہ یہ بھی ہو گا کہ ”ہم بندگی کرتے ہیں“ اور یہ بھی ہو گا کہ ”ہم بندگی کرتے رہیں گے“۔ اسی طرح ”نَسْتَعِينُ“ کا ترجمہ یہ بھی درست ہو گا کہ ”ہم مدد مانگتے ہیں“ اور یہ بھی صحیح ہو گا کہ ”ہم مدد مانگیں گے“۔

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اگر یہاں ”نَعْبُدُ كَ“ کا لفظ ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ ”ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے“ لیکن چونکہ ضمیر مفعولی ”كَ“ کو فعل سے پہلے لایا گیا اور اس کے لئے ”اِيَّا“ کا اضافہ کیا گیا، یعنی ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ“ تو اس میں ایک مزید تاکید مفہوم پیدا ہو گیا اور وہ یہ کہ ”ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے“۔ اس کو قواعد کی رو سے حصر کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ”زید عالم ہے“ تو اس سے ایک خاص مفہوم ذہن میں آئے گا، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ”زید ہی عالم ہے“ تو اس ”ہی“ کے اضافے سے مفہوم میں عظیم فرق واقع ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جب یہ کہا گیا کہ زید عالم ہے تو دوسروں کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔ گویا دوسرے بھی عالم ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ زید ہی عالم ہے، تو اس میں حصر پیدا ہو گیا اور اس کا مفہوم یہ ہو گیا کہ ”علم“ صرف زید ہی کے پاس ہے، دوسروں سے ”علم“ کی نفی ہو گئی۔ لہذا ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ“ میں اسی حصر کا مفہوم پیدا ہے۔ اس کا ترجمہ اور حقیقی مفہوم ہو گا: ”ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے“۔ اسی طرح ”اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کا مفہوم ہو گا: ”ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے“۔

تیسری بات یہ کہ اس آیت کا مرکزی لفظ ”عبادت“ ہے، جس کا ہم اقرار بھی کر رہے ہیں اور عہد بھی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ ”ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں“ یہ اقرار ہے یا اظہارِ واقعہ؟ اور ہم تیری ہی عبادت کریں گے؟ یہ ایک وعدہ، قول و قرار اور

عبد و میثاق ہے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ عبادت کا حقیقی معنی و مفہوم کیا ہے؟ بد قسمتی سے اس لفظ عبادت کے بارے میں عوام الناس کے ذہنوں میں بڑا محدود تصور پایا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عبادت بس نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام ہے۔ چنانچہ جب بھی عبادت کا لفظ سامنے آتا ہے ذہن لامحالہ صرف ان عبادات ہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس لفظ کی اصل عظمت اور وسعت سامنے نہیں آتی۔ اس لئے جان لیجئے کہ اس لفظ عبادت کا مادہ ”ع ب د“ ہے اور ”عبد“ غلام کو کہتے ہیں۔ غلامی کا وہ تصور جو کبھی دنیا میں رائج تھا وہ سامنے ہو تب اس لفظ کی اصل حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ جو شخص کسی کا عبد یعنی غلام ہوتا تھا، وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ اس کا کام اپنے مالک کے احکام کو بجالانا ہوتا تھا۔ آقا جو حکم دیتا تھا غلام کا فرض تھا کہ وہ بسر و چشم اس کی تعمیل کرے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ غلام تو مملوک ہوتا تھا، اس کا کام تو اپنے آقا کی مرضی پر چلنا تھا۔ اس کی پسند اور ناپسند اول تو رہی ہی نہیں چاہئے تھی اور اگر رہتی بھی تو اس کا فرض تھا کہ اسے پس پشت ڈال دے اور اپنے آقا کی پسند و ناپسند اور مرضی و ناراضی کو مقدم رکھے۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ عبد میں جو تصور مضمر ہے وہ مکمل اور ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ جہت غلامی کا تصور ہے۔ فارسی میں اس کے لئے بہترین لفظ ”بندگی“ ہے، چنانچہ عبد کے مفہوم کے لئے بندہ کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا۔

”تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے“

یعنی یہ کہ انسانوں ہی میں سے کوئی آقا بن جائے اور کوئی بندہ، تو اس سے زیادہ غلط اور خلافِ انسانیت بات اور کوئی نہیں! اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اے لوگو! تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ“ تم سب اللہ کے بندے ہو، اس اعتبار سے برابر ہو، بھائی بھائی ہو، تم میں سے کوئی آقا اور غلام ہے ہی نہیں۔ حقیقی آقا اللہ ہے اور تم سب اس کے غلام ہو۔

بندگی کے اس ہمہ گیر تصور کو سامنے رکھ کر اس حقیقت کی جانب توجہ کی جائے تو پانچویں اہم بات یہ سامنے آئے گی کہ از روئے قرآن مجید غایت تخلیق جن و انس یہی

عبادتِ رب ہے۔ چنانچہ سورہ ذاریات میں ارشاد ہوتا ہے : ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ یعنی ”میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں“۔ یہ ہے ہماری غایت تخلیق۔ قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس شعر میں کی ہے جو بہت سی مسجدوں میں لکھا ہوتا ہے کہ۔

زندگی آمد برائے بندگی

زندگی بے بندگی شرمندگی

چھٹی قابل غور بات یہ ہے کہ کوئی شے جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد ہی کو پورا نہ کرے تو ظاہر بات ہے کہ وہ بے کار قرار پائے گی اور ہم اسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ لہذا جب انسان کی تخلیق ہوئی ہی بندگی کے لئے ہے تو اگر وہ بندگی کی روش کو اختیار نہ کرے یا اسے تھوڑے اور ترک کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کا اب کم از کم انسانی سطح پر کوئی مقصد نہیں رہا۔ اور اس کی زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی ہے یا شاید اس سے بھی کم تر!

اس ضمن میں ساتویں اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ ”ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے“ تو یہ ایک بہت بڑا عہد ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں، جن کو سمجھے اور جانے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ (یاد رہے کہ یہ باتیں ہمارے سامنے شرک فی العبادت کی بحث کے ضمن میں پہلے بھی آچکی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب ان کا ایک دوسرے سیاق و سباق میں اعادہ ہو رہا ہے۔)

عبادت کا سب سے پہلا تقاضا اطاعت ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو عبادت کی اساس ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ پھر بندگی کہاں ہوئی؟ مزید برآں اطاعت اگر ٹکلی نہ ہو جزوی ہو تب بھی عبادت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ کسی غلام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ایک حکم کو مانے اور ایک نہ مانے۔ غلام نے اگر آقا کے ایک حکم سے بھی سرتابی کی تو وہ مقام بندگی سے تجاوز کر گیا۔ لہذا اطاعت لازم ہے تمام احکام خداوندی کی، ہر آن اور ہر لحظہ اور زندگی کا کوئی گوشہ بندگی سے غلام کو مستثنیٰ نہیں ہے۔ لہذا قرآن مجید میں فرمایا

گیا : ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً“ (البقرہ : ۲۰۸)
 ”اے اہل ایمان! (اطاعت اور) فرمانبرداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“ گویا
 جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے کہ اللہ کی کچھ باتوں پر تو سر تسلیم خم ہو اور کچھ باتوں سے
 انحراف کیا جائے۔ اس پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ۸۵ میں
 اس طرز عمل پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا :

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ
 يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ
 يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾
 ”کیا تم ہماری کتاب (اور ہماری شریعت) کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور کچھ
 حصوں کو نہیں مانتے؟ تو جو کوئی اس جرم کا ارتکاب کرے گا اس کی سزا اس کے سوا
 کچھ نہیں ہے کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور قیامت کے
 دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم
 کرتے ہو۔“

یہ ہے جزوی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا عالم! اس لئے کہ جزوی اطاعت حقیقت
 کے اعتبار سے استہزاء اور تمسخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں فرمایا : ”اور
 اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو“ اس گمان میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے کرتوتوں
 سے واقف نہیں ہے بلکہ وہ تو العليم، البصير، اللطيف اور الخبير ہے۔ اس سے تمہارا کوئی عمل
 پوشیدہ نہیں ہے۔

آٹھویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک اطاعت ہوتی ہے زبردستی کی، جیسے ہم
 انگریز کے غلام تھے اور ہم اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ اس اطاعت پر بھی لغوی طور پر لفظ
 عبادت کا اطلاق ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ چنانچہ آل فرعون نے بنی اسرائیل
 کو جس طریقے سے اپنی غلامی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا، اس کے لئے قرآن مجید میں یہی لفظ
 عبادت آیا ہے۔ فرعون نے بڑے فظفے اور غرور کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت
 ہارون (علیہما السلام) کے بارے میں کہا تھا : ”وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ“

(المومنون : ۴۷) ”ان دونوں کی قوم ہماری عابد ہے“ یعنی ہماری غلام ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت موسیٰؑ نے بھی فرعون سے فرمایا تھا : ”..... اَنْ عَبَدْتُ بَنِي اِسْرَآءِیْلَ“ یعنی ”تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام، اپنا محکوم اور مطیع بنایا ہے“۔ لہذا اس نوع کی غلامی اور محکومی پر بھی لفظاً تو عبادت کا اطلاق ہو جائے گا لیکن اصطلاحاً اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے وہ زبردستی اور مجبوری کی اطاعت نہیں بلکہ دلی آمادگی اور محبت کے ساتھ مطلوب ہے۔ اللہ کے احسانات و انعامات کا شعور و ادراک کرتے ہوئے کہ اس کے جذبہ تشکر سے قلب و ذہن سرشار ہو جائیں، ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب اللہ کی بندگی ہوگی، اس کی کامل اطاعت ہوگی تب عبادت کا اصل تقاضا پورا ہوگا، جس کو ہمارے ائمہ دین نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا فرمایا ”اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے، اس میں دو بنیادیں جمع ہونی چاہئیں“ یعنی ”ایک طرف اللہ کی انتہا درجہ کی محبت ہو اور دوسری طرف انتہا درجے میں اس کے سامنے تذلل اور عاجزی اختیار کی جائے، اس کے سامنے ہمہ تن جھک جایا جائے، بچھ جایا جائے“۔ جب یہ دونوں کیفیات ——— محبت اور تذلل ——— جمع ہو جائیں گی تو عبادتِ رب اور بندگیِ رب کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔ محبتِ الہی عبادت کے لئے کس قدر لازمی ہے، مولانا رومؒ نے اسے اپنے زمانے میں بڑی خوبی سے ادا کیا تھا کہ :

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ رِعلت ہائے ما

اور اس دور میں علامہ اقبال مرحوم نے اس کی اہمیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیس ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بیکدہ تصورات

محبتِ الہی عبادت کی روح ہے، اگر یہ روح نہیں ہے اور صرف خالی خولی اطاعت ہے، دل کی محبت کی چاشنی اس میں شامل نہیں ہے تو علامہ اقبال کے بقول معاملہ یہ ہو گا کہ :

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام!

میرا قیام بھی چاہ میرا سجدہ بھی چاہ

لہذا ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ محبت درحقیقت عبادت کی روح ہے۔

نویں بات یہ ہے کہ عبادت میں اطاعتِ کلی و محبتِ حقیقی کے ساتھ جو تیسری چیز مطلوب ہے وہ اخلاص ہے۔ اس سے قبل سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں اقسامِ شرک کی بحث میں بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ آج پھر اس کا اعادہ کر لیجئے۔ عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم اخلاص ہے، یعنی اللہ کی بندگی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس میں کوئی ریاکاری نہ ہو اور اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز مطلوب و مقصود کے درجے میں نہ آجائے۔ مطلوب صرف اللہ کی رضا اور اخروی فلاح و نجات ہو۔ اگر یہ اخلاص و للہیت موجود نہیں ہے بلکہ کوئی ریاکاری ہے، یعنی لوگوں پر اپنی عبادت گزاری اور اپنے زہد و تقویٰ کی دھونس جمانی ہے اور اپنی نیکی کا رعب قائم کرنا ہے، یا شہرت مطلوب ہے، یا دنیا کی کوئی منفعت پیش نظر ہے تو یہ خلوص سے خالی عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی۔ بلکہ، جیسا کہ اس سے قبل واضح ہو چکا ہے، شرکِ خفی شمار ہوگی۔ جیسے ”اقسامِ شرک“ کی بحث میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان ہو چکی ہے کہ ”جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا“ جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا، جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا۔ اس حدیث سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے دین میں خلوص و اخلاص کی کس قدر اہمیت ہے اور ریا کی کتنی مذمت ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل جاتے ہیں۔

اب آخری اور دسویں بات پر غور کیجئے کہ پوری زندگی میں پورے خلوص و اخلاص، شدید ترین قلبی محبت اور کامل اطاعت کے ساتھ عبادت کا حق ادا کرنا، واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، بہت مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہی آڑے آتا ہے۔ مولانا رومؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست

لیکن او را عونِ ایں را عون نیست

فرعون کے پاس حکومت تھی، لاؤ لشکر تھا۔ اس لئے اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ میرا نفس بھی اگرچہ فرعون سے کمتر نہیں ہے البتہ اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے اس

لئے وہ خدائی کا زبانی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اندر سے وہ کہتا یہی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ کا حکم کیا ہے! میری مرضی چلے گی۔۔۔۔۔ خود غور کیجئے کہ اذان کی آواز کان میں آگئی ہے گویا اللہ کا حکم ہے کہ نماز کے لئے آؤ۔ ادھر نفس کہہ رہا ہے کہ ابھی مزید سوتے رہو، مزید آرام کرو، یا جس دلچسپی میں مصروف ہو اسے جاری رکھو۔ اب فیصلہ کن بات یہ ہوگی کہ ہم نے کس کا حکم مانا! اگر نفس کی خواہش کو کچلتے ہوئے ہم نے اللہ کا حکم مانا اور نماز کے لئے نکل کھڑے ہوئے تو واقعی ہم بندہ رب ہیں۔ اگر نفس کی خواہش پر عمل کیا اور اللہ کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تو ہم بندہ نفس ہو گئے۔۔۔۔۔ یہی بات سورہ فرقان میں فرمائی گئی :

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ ۚ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝
(الفرقان : ۳۲)

”(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنالیا، تو کیا آپ ایسے شخص کا ذمہ لے سکتے ہیں!“

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دامن مشکلات لا الہ را

یعنی ”میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے“ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ لا الہ الا اللہ پر پورا اترنا کتنا مشکل ہے!“

یہ ہے ربط و تعلق کہ جب بندہ کہے : ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ تو اس پر ایک لرزہ طاری ہو جائے، اسے پورا احساس اور کامل شعور ہو کہ وہ کتنا بڑا قول و قرار کر رہا ہے۔ اس کیفیت میں اسے پناہ گاہ نظر آئے گی ”وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کے الفاظ مبارکہ میں۔۔۔۔۔ کہ اے اللہ میں یہ وعدہ اور عہد تو کر رہا ہوں اور میں نے ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ پوری زندگی تیری عبادت میں بسر کروں گا لیکن میں محض اپنی قوت اور طاقت کے بل پر اس ذمہ داری سے عہدہ بردار نہیں ہو سکتا اور اس عہد پر پورا نہیں اتر سکتا جب تک کہ تیری مدد شامل حال نہ ہو۔ میں اس عہد کے پورا کرنے میں تیری اعانت اور تائید و توفیق کا محتاج ہوں۔ تیری اعانت اور مدد شامل ہوئی تب ہی میں اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو پورا کر

سکوں گا۔ یہ تو ہے اصل ربط و تعلق ”ایَّاكَ نَعْبُدُ“ کے ساتھ ”ایَّاكَ نَسْتَعِیْسُ“ کا اضافی طور پر اس میں اخلاص فی الدعاء کا مضمون بھی آگیا۔ اس لئے کہ یہاں بھی حصر کا اسلوب ہے۔ گویا ہر نوع کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے اللہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے، اسی سے اعانت طلب کی جائے، اسی کے جناب میں استغاثہ پیش کیا جائے۔ یہ توحید فی الدعاء ہے، جس کا ذکر اس سے قبل اقسام شرک کی بحث کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

اسی آخری بات کے ضمیمے کے طور پر یہ بھی نوٹ فرمالیجے کہ ہر فرض نماز کے بعد جو اذکار نبی اکرم ﷺ کے معمول میں شامل تھے، ان میں یہ دعا بھی منقول ہے: ”رَبِّ اَعِیْسِ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ“ یعنی ”اے پروردگار میری مدد فرماتا کہ میں تجھے یاد رکھ سکوں، تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری عبادت کا باحسن وجہ حق ادا کر سکوں۔“

جزو ثالث : درخواستِ ہدایت

سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ اگرچہ تین آیات پر مشتمل ہے تاہم ان سے جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ آئے کہ پہلے ان تین آیات مبارکہ اور ان کے ترجمے پر ایک نظر ڈال لیں :

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ ﴾ (آمین یا رب العالمین!)

”(اے رب ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا، جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔“

(اے تمام جہانوں کے مالک! ایسا ہی ہو)

پہلی تین آیات پر تدریس ہم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ایمان باللہ یا توحید اور ایمان بالآخرۃ یا معاد تک ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان فطرت و عقل کی رہنمائی

میں از خود بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے باطن میں ایک بے پناہ جذبہ تشکر پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھی آیت سے معلوم ہوا کہ اسی جذبہ تشکر سے جذبہ عبادت ابھرتا ہے۔ اس سے آگے واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی خود اپنی محدودیت اور نارسائی کا اعتراف کرتی ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم یعنی زندگی بسر کرنے کے معتدل و متوازن طریقے کا تعلق ہے، وہاں انسانی عقل بے بس اور محتاج ہدایت ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ مقام جہاں بندہ سراپا احتیاج بن کر ایک استاد اور ایک درخواست اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے کہ اے رب ہماری رہنمائی فرما یعنی ہمیں دکھا اور چلا اس راستہ پر جس میں کوئی کجی نہ ہو، کوئی ٹیڑھ نہ ہو، افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں، جو ہمیں سیدھا تیری رضا تک پہنچانے والا، اور آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے والا ہو۔

”ہدایت“ عربی زبان کا ایک نہایت وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ راستہ دکھایا جائے، بتا دیا جائے، بچھادیا جائے، یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس راستے پر ذہن اور قلب کو مطمئن کر دیا جائے اور یہ بھی شامل ہے کہ انگلی پکڑ کر اس راستے پر چلایا جائے اور بالآخر وبالفضل منزلِ مراد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں۔ سورہ محمد (ﷺ) میں فرمایا: ”وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْهُمْ هُدًى وَآتَيْنَاهُمْ تَقْوَاهُمْ“ (آیت ۱۷) ”وہ لوگ جو ہدایت کے راستے پر آئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے حصہ کا تقویٰ عطا فرما دیا۔“ اسی طرح سورہ مریم میں فرمایا: ”وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى“ (آیت ۷۶) ”اور اللہ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت اور راست روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔“ یہ ہدایت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام مدارج و مراحل مومنین صادقین کو طے کرا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مراد تک جا پہنچتے ہیں اور جنت میں داخلے کے وقت ان کی زبانوں پر یہ ترانہ حمد جاری ہو جاتا ہے:

”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنَّ هَدَانَا اللَّهُ“۔ ”سارا شکر و سپاس اور کل تعریف و ثناء اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں راستہ دکھایا اور ہمیں یہاں تک پہنچا دیا اور ہم خود ہرگز راہ یاب نہ ہو سکتے اگر اللہ ہی

رہنمائی نہ فرماتا۔ واضح رہے کہ یہی عقلی بنیاد ہے ایمان بالرسالت کی، کیونکہ ہدایت الہی رسولوں ہی کے واسطے سے بنی نوع انسان تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ سورہ اعراف کی اس آیت کے آخر میں کامیاب و بامراد مومنین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے: ”لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ“ یعنی ”ہمارے رب کے رسول واقعی حق لیکر ہی تشریف لائے تھے۔“

یہاں یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ شخص جو بنیادی حقائق تک خود پہنچ چکا ہے، جس نے اللہ کو پہچان لیا، اس کی توحید کو جان لیا، اس کی صفات کمال کی معرفت حاصل کر لی، اس کی ربوبیت، رحمانیت و رحیمیت کا ادراک و شعور حاصل کر لیا، اس کے مالک یوم الدین ہونے کا اقرار کر لیا، پھر اس کی بندگی اور پرستش کا عہد و پیمان کر لیا تو اسے تو گویا کل ہدایت حاصل ہو گئی۔ اب اسے کون سی مزید ہدایت مطلوب ہے جس کے لئے وہ دعا کر رہا ہے کہ ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“۔ یہاں انسان کی احتیاج کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیوی زندگی کے مختلف معاملات میں جو نہایت پیچیدہ ہیں اور ان مسائل میں جو باہم گتھے ہوئے ہیں ایک اعتدال کی روش اور ایک متوازن طرز عمل کا محتاج ہے اور اس کی یہ احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی، اس لئے کہ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان مسائل و معاملات کی پیچیدگیاں بھی مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہیں اور حیات انسانی کی یہ پیچیدگیاں اور ان کے گوناگوں تقاضے اور مطالبے اور ان کا آپس میں ٹکراؤ اور تصادم، یہ عقدہ ہائے لائخل ہیں اور کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجرد اپنی عقل اور تجربے کی بنیاد پر ان جملہ سماجی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی مسائل کا متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ حل تلاش کر سکے اور حیات اخروی میں بھی نجات اور فوز و فلاح حاصل کر سکے، جس پر چل وہ حیات دنیوی کی برکتوں اور سعادتوں سے بھی پرسکون طور پر ہمتا کر ہو سکے۔ یہ ہے درحقیقت انسان کی اہم ضرورت جس کے لئے سلسلہ نبوت و رسالت اور انزال وحی و کتب کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک ایمان کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے، جیسا کہ سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے ذریعے یہ حقیقت ظاہر ہے۔

رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، لیکن زندگی کی پرتپ وادیوں میں سیدھی راہ کی تلاش، یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لئے وہ مجبور ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اپنے مالک سے ہدایت کی درخواست کرے، اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہی واحد ممکن راستہ ہے۔

اس بات کو انسانی تمدن کے چند پیچیدہ مسائل کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں اولین اور قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے مابین حقوق اور فرائض کا صحیح توازن کیا ہے۔ ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ اس معاملے میں تاریخ انسانی میں شدید افراط و تفریط نظر آتی ہے۔ کسی معاشرے میں عورت بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک مملوک کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت قلو پترہ بن کر کسی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہے اور اس کے لئے تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ مرد و عورت کے درمیان توازن و اعتدال اور عدل و انصاف عقل انسانی کے بس میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان لازماً مرد ہو گیا عورت، اور ان میں سے ہر ایک صرف اپنی ہی مصلحتوں اور مفادات کو مد نظر رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا یہاں انسان اس فاطرِ فطرت کی رہنمائی کا محتاج ہے جس نے مرد کی تخلیق بھی کی ہے اور عورت کی بھی۔ جو دونوں کے عواطف اور میلانات کو بہ تمام و کمال جاننے والا ہے، جو تہذیب و تمدن میں دونوں کے حقوق و فرائض کا ایسا صحیح صحیح تعین کر سکتا ہے جس کی بدولت انسانی تمدن کی گاڑی دونوں پیسوں پر ہمواری کے ساتھ سیدھی راہ پر آگے بڑھ سکے۔

دوسری مثال فرد اور اجتماعیت کے باہمی تعلق و توازن سے متعلق ہے۔ اگر افراد کی انفرادی آزادی پر حدِ اعتدال سے زیادہ زور ہوتا ہے اور ان کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے تو پلڑا ایک جانب جھک جاتا ہے اور مادر پدر آزادی انتشار اور انارکی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعیت اس طور پر مسلط ہو جاتی ہے کہ اس کے نیچے فرد سسکنے لگتا ہے اور اس کے حقوق بالکل پامال ہو جاتے ہیں۔ اس کی آزادی اور حریت کو اجتماعیت کی بھیٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین توازن قائم رکھنا، یہاں تک کہ عقل انسانی کی صلاحیت نہیں

رکھتی کہ وہ ایسے صحیح نقطہ عدل کا تعین کر سکے کہ فرد کے حقوق بھی برقرار رہیں، اس کی انفرادی شخصیت کے صحت مندار تقاء کے امکانات بھی روشن رہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد معاشرے کے لئے ایک مضر اور نقصان دہ عنصر کی حیثیت اختیار نہ کر سکے، بلکہ ان دونوں کے مابین ایک غنی بر عدل اور کامل توازن والا نظام قائم ہو سکے۔ عمرانیات کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی اس سے واقف ہیں کہ انسانی عقل اور تجربات تاحال ایسا نظام قائم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں اور ان کے تجویز کردہ نظام لازماً افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں۔

یہی معاملہ معاشی مسائل کا بھی ہے جنہوں نے خاص طور پر صنعتی انقلاب کے بعد ایک نہایت گھمبیر اور لانا بیل عقدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن کیسے قائم کیا جائے اور اقتصادی معاملات میں عدل و اعتدال کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں۔ اس معاملے میں نقطہ عدل و قسط کی تلاش میں نوع انسانی کتنی سرگرداں ہے اور کیسے کیسے تجربے کر رہی ہے، وہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ کہیں وہ انفرادی ملکیت کی نفی کلی کا تجربہ کرتی ہے جس سے انسان کی شخصی آزادی اور اس کی آزاد شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ایک سرمایہ دارانہ آمریت معاشرے پر مسلط ہو جاتی ہے جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے ایک باعزت اور آسودہ زندگی بسر کرنا محال ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تین پیچیدہ اہمات المسائل جن کے گونا گوں شعبوں اور پتچ در پتچ شاخوں اور پھر ان کے متضاد تقاضوں کو ایک متوازن و معتدل نظام میں سمونے سے انسان قاصر ہے۔ اس لئے کہ ان کے حل کے لئے جب بھی انسان سوچے گا، اپنے قریبی ظروف و احوال میں رہ کر سوچے گا، اور ان کا حل تلاش کرنے میں وہ اپنی ذات، گروہ یا طبقے سے بلند تر ہو کر معتدل اور منصفانہ راہ تلاش نہ کر پائے گا اور اس کی سوچ میں کہیں نہ کہیں کجی رہ جائے گی۔ اس کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ صراطِ مستقیم اور سوائے السبیل سے ہٹ جائے گا۔ قرآن مجید اس معتدل اور متوازن راستے کو مختلف ناموں

سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں اسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے یعنی سیدھا راستہ۔ کہیں اسے سَوَاءُ السَّبِيلِ کہا گیا ہے، کہیں صِرَاطُ السَّوِيِّ یعنی برابری کا راستہ، جیسے خط استوا ہے جو ہمارے کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پس سَوَاءُ السَّبِيلِ وہ راستہ ہو گا جس میں کامل توازن ہو، افراط و تفریط نہ ہو، کسی ایک جانب جھکاؤ نہ ہو جائے۔ کہیں اسے قَصْدُ السَّبِيلِ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی معتدل اور درمیانی راستہ جس میں نہ ایچ پیج ہو نہ او نیچ پیج، کہیں اسے سَبِيلُ السَّلَامِ کہا گیا ہے یعنی سلامتی کا راستہ جس میں امن و سکون ہو، ظلم و عدوان نہ ہو، تعدی و استحصال نہ ہو۔

یہ ہے درحقیقت انسان کی وہ احتیاج جس کے لئے وہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے سامنے استدعا کرنے پر مجبور ہے کہ اے میرے رب! میں نے تجھے پہچان لیا، تیری توحید کو جان لیا، ادنیٰ درجہ ہی میں سہی لیکن مجھے تیری صفاتِ کمال کی معرفت بھی حاصل ہو گئی۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مجھے مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ اس دن کامل اختیار صرف تیرے ہاتھ میں ہو گا۔ میں نے یہ ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ میں تیری ہی بندگی اور پرستش کروں گا اور اس کے لئے میں تیری ہی اعانت و امداد کا محتاج ہوں۔ لہذا اب میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ زندگی بسر کرنے کا صراطِ مستقیم، سَوَاءُ السَّبِيلِ اور سَبِيلُ السَّلَامِ مجھ پر واضح فرمادے۔ مجھے اس کی ہدایت عطا فرما، اس کے لئے میرے دل کو اطمینان و انشراح بخش۔ مجھے اس پر چلنے کی توفیق دے۔ اس پر چلاتے ہوئے مجھے میری کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کی آخری منزل تک پہنچا دے۔ واضح رہے کہ یہی ایمان بالرسالت کی عقلی بنیاد ہے کیونکہ اس ہدایتِ ربانی کو انسانوں تک پہنچانے کے منصبِ جلیل پر رسولوں کی مقدس جماعت فائز ہوتی رہی ہے اور اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہیں، خاتم النبیین، سید المرسلین، ہادیِ آخر الزمان جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کی اہمیت و وقعت زیادہ ہوتی ہے اسے مزید واضح کیا جاتا ہے، چنانچہ انسان کے دل میں جس چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ لہذا اس صراطِ مستقیم کی اہمیت پر زور دینے کے لئے اس کی مزید وضاحت خود اس کی

زبان سے کرائی جا رہی ہے کہ :

﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

”(اے رب) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا“

یہ لوگ کون ہیں؟ اس سورہ مبارکہ میں غایتِ اجمال و اختصار ہے۔ اس لئے یہاں ساری تفصیل ممکن نہیں تھیں۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر کا یہ اصول پیش نظر رکھئے کہ ”القرآنُ یفسِّرُ بعضُهُ بعضًا“ یعنی ”قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔“ اس کے مطابق اگر تلاش کیا جائے کہ ”أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ کی تفسیر قرآن مجید میں کہاں وارد ہوئی ہے تو سورہ نساء کی یہ آیت سامنے آئے گی :

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝﴾ (آیت : ۶۹)

”اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول اطاعت پر کاربند ہو جائیں گے ان کو معیت اور رفاقت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ رفیق (جو کسی کو میرا جائیں)۔“

یہ چار گروہ ہیں مُنْعَمٌ عَلَیْہِمْ کے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام و فضل ہوا، یہ ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ان میں انبیائے علیم السلام سب سے بلند اور سب سے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کے بعد درجہ ہے حضراتِ صِدِّیقین کا۔ ان کے بعد تیسرے نمبر پر آتے ہیں شہدائے کرام، پھر چوتھے نمبر پر عام مومنین صالحین ہیں۔ اس موقع پر نوکِ قلم پر دعا آ رہی ہے کہ اے رب ہمارے! ہمیں ان مُنْعَمٌ عَلَیْہِمْ کے راستے کی ہدایت بخش، ہمیں ان کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے اور ہمیں ان کی رفاقت نصیب فرما!

صراطِ مستقیم کی اس مثبت انداز میں وضاحت کے بعد ایک سلبی اور منفی انداز میں بھی وضاحت کی گئی :

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾

”جو نہ مغضوبِ علیم میں شامل ہیں اور نہ ہی گم کردہ راہ ہیں۔“

درحقیقت یہ دو کیفیات یا دو درجات ہیں جنہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا۔ ایک درجہ مغضوبِ علیم کا ہے جو بہت ہی ناپسندیدہ ہے اور گویا ضَلَّ ضَلَّالًا بَعِيدًا کا مصداق ہے۔ جب کوئی فرد یا قوم یا امت ہدایت کی راہ کو اپنے نفس کی شرارتوں کے باعث اور اپنی خواہشات و شہوات کا اتباع کرتے ہوئے جان بوجھ کر چھوڑ دے، صداقت و ہدایت کی راہ سے جان بوجھ کر اعراض کرے، اس سے منہ موڑے تو ان کو قرآن ”مغضوبِ علیم“ قرار دیتا ہے۔ یعنی جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ گویا جو لوگ حق کو حق اور باطل کو باطل جان کر بھی اپنے تعصبات کی وجہ سے یا اپنی خواہشات کی وجہ سے یا اپنے تکبر اور حسد کی بنیاد پر حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتے ہیں تو وہ مغضوبِ علیم ہیں۔

ایک دوسرا گروہ ان کا ہے جو مغالطوں میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، جیسے ہم ”نیکی کی حقیقت“ کی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان غلط راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کا کوئی اچھا جذبہ غیر معتدل ہو کر کسی غلط صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے: ضَالِّينَ وہ لوگ جو بھٹک گئے، گم کردہ راہ ہیں، وہ قافلہ جو اپنا صحیح راستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا۔ لفظ ”ضال“ کا ایک دوسری صورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ جو شخص ابھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہو، اس کے اندر طلبِ ہدایت موجود ہو، لیکن ابھی وہ غور و فکر کے مراحل طے کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الضحیٰ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا: ”وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَا“ یعنی ”(اے نبی!) آپ کو پایا آپ کے رب نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں تو آپ پر ہدایت کا راستہ کھول دیا۔“ آپ میں تلاشِ حقیقت کا جذبہ اس شدت کے ساتھ ابھرا کہ آپ نے غارِ حرا کی خلوت گزینی غور و فکر اور سوچ بچار میں کلی انہماک کے لئے اختیار فرمائی، لہذا پروردگار کی جانب سے پردے اٹھا دیئے گئے اور وحی کا آغاز ہو گیا۔

الغرض ضالین کا لفظ مغضوبِ علیم کی بہ نسبت بہت ہلکا ہے۔ مغضوبِ علیم وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرارتِ نفس کے طفیل محض اپنی خواہشات و شہوات کے اتباع میں حق کو

جان بوجھ کر ترک کر دیا اور ضالین وہ ہیں جو یا تو کسی مغالطے کے باعث راہ حق سے بھٹک گئے یا ابھی تلاش حق میں سرگرداں ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مغضوب علیہم کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں، جنہوں نے جو ٹھوکریں کھائیں وہ کسی اندھیرے کے باعث نہیں کھائیں بلکہ اس وقت کھائیں جب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ان کے پاس اللہ کا کلام موجود تھا، اللہ کی ہدایت موجود تھی، اللہ کی شریعت موجود تھی، لیکن اپنی شرارتِ نفس کے باعث انہوں نے اس میں تحریفات کیں۔ اس کے بجائے کہ اپنے آپ کو اللہ کی منشاء کے مطابق ڈھال لیتے انہوں نے اللہ کے کلام اور اس کے قانون کو اپنی خواہشات کے رخ پر ڈھال لیا۔ یعنی وہی رویہ ہے جو علامہ اقبال کے بقول ہمارے علمائے سوء نے اختیار کیا کہ۔

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ قیہانِ حرم بے توفیق

اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین، امتِ مسلمہ کے آخر الامم اور قرآن کے ”نوعِ انساںِ راہِ ایمِ آخریں!“ کے مصداق آخری کتاب ہونے کی برکت سے قرآن کا متن محفوظ و مصون رہا اور تحریف جو بھی ہوئی صرف ترجمہ اور تفسیر میں ہوئی جبکہ سابقہ امتیں، بالخصوص یہود اس معاملے میں بہت دور نکل گئے تھے اور ان کے علماء نے تو اللہ کی کتاب میں لفظی تحریف تک کر دی تھی۔ لہذا یہ ”مغضوب علیہم“ کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق قرآن کتاب ہے۔ : ”ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُ وِغْظٍ مِنَ اللَّهِ“ یعنی ”ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔“ اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے حامل ہونے کے باوجود اپنی شرارتِ نفس کے باعث اس ہدایت سے روگردانی کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

سابقہ امم میں سے ”ضالین“ کی نمایاں مثال نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ہیں۔ اس لئے کہ محبت اور عقیدت کے غلو میں انہوں نے حضرت مسیحؑ کا مقام اتنا بڑھایا کہ معاذ اللہ انہیں ”مسیح“ کے علاوہ کسی اور معبود کی رہبانیت کی

بدعت اختیار کی جس کے متعلق سورہ حدید میں ارشاد ہوا: ”وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ“ یعنی ”رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے اختیار کی، ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا۔“ یہ درحقیقت ایک خلافِ فطرت نظام تھا جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی نیکی کے جذبے میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے اوپر غیر فطری پابندیاں عائد کرتے ہوئے اختیار کر لیا تھا۔ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے باہمت نکلے جو ان پابندیوں کو نباہ گئے لیکن ان کی اکثریت ان پابندیوں کو نباہ نہ سکی۔ نتیجتاً جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ ہوا اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان آباد ہو گئے۔ یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے فطرت کے خلاف کام کیا۔ چنانچہ مفسرین کی اکثریت کے نزدیک سورہ فاتحہ میں ”مغضوب علیہم“ سے مراد یہود اور ”ضالین“ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ویسے اس مفہوم کو عام رکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی دونیاں مثالوں سے یہ بات صد فیصد درست ہے۔

بہر حال یہ ہے سورہ فاتحہ کا وہ تیسرا حصہ جس کے بارے میں اس حدیثِ قدسی میں جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ”هَذَا الْعَبْدِي وَلِعَبْدِي“ ماسئل ”یعنی“ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے دیا اپنے بندے کو جو اس نے طلب کیا۔“ واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیثِ قدسی اس سورہ مبارکہ کے تجزیہ میں بھی بہت مفید ہے اور اس کی عظمت کو بھی تمام و کمال اور بحسن و خوبی ظاہر کر رہی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کی وہ ترجمانی ہے کہ اگر واقعیہ الفاظ کسی شخص کی زبان سے گہرے شعور و احساس اور قلب و ذہن کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں تو ان کی تاثیر وہی ہے جو اس حدیثِ قدسی میں وارد ہوئی کہ ادھر بندہ ایک ایک جملہ کہتا ہے ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ملتا چلا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

سورہ فاتحہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورہ مبارکہ قرآن حکیم کا

ایک نہایت @nasailojaraid.com فطرتِ انسانی کی وہ پیاس

اور صراطِ مستقیم کی وہ احتیاج جس کی ترجمانی سورہ فاتحہ میں کی گئی ہے اسی کی جانب رہنمائی کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے فوراً بعد وارد ہوتے ہیں یہ الفاظِ مبارکہ ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَكَ الْكِتَابُ لَا يُؤْتِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ یعنی یہ ہے وہ کتاب جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ کسی فلسفی کے من گھڑت خیالات و نظریات اور ذہن انسانی کی تنگ و تاز پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ”الحق“ یعنی سراسر حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہے جن میں سیدھے راستے کی طلب اور پیاس موجود ہے۔ گویا یہ ہے اس سورہ مبارکہ کا پورے قرآن مجید کے ساتھ تعلق۔ مزید برآں مباحثِ ایمان کے ذیل میں اس سورہ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی عقل اور فطرت کی رہنمائی میں کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی ہے وہ بات جسے علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا۔

عقل گو آستان سے دُور نہیں

اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

عقل یقیناً آستان سے دور نہیں ہے، اس کی رہنمائی میں انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں وہ محتاج ہے وہ درحقیقت وہ ہدایت و رہنمائی ہے جو اسے اپنی زندگی کے گوناگوں اور مختلف پہلوؤں میں ہر لحظہ اور ہر قدم پر عمل کے لئے درکار ہے۔ اس کے لئے وہ ہدایتِ آسمانی کا بالکل محتاج ہے۔ اسی لئے اس کی فطرت پکارتی ہے اور استدعا کرتی ہے: **رَاهِدْنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ**۔ اس فطرت کی پکار کا جواب ہے پورا قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے اور اس پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ